عظمتِ غالبؔ

فکر و فن

عبدالمغنی

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند نمبر ۶۰۴

سنہ اشاعت : ۱۹۹۰ء
قیمت : ۳۵/-
بہ اہتمام : شمیم جہاں
تزئین کار : انیس احمد
طباعت : ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دلی

ISBN 81 - 7160 - 018 - 2

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
Urdu Ghar, Rouse Avenue,
New Delhi-110002


طالب دعا: محمد شاہد اقبال ایم فل اسکالر

تیرے نام سے ابتداء کر رہا ہوں

میری انتہاء یہ نگارش ہی ہے

نوائے زیست

دعاگو :-

ایڈمن :- محمد شاہد اقبال

(ایم فل سکالر پروپاسی)

عمارہ ممتاز ، ایم فل سکالر پروپابی

متاعِ زیست کیا ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں :-

جسے سب درد کہتے ہیں اُسے ہم دل سمجھتے ہیں :-

Scanned with CamScanner

غالب کا احساسِ عصر

غالب نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو ۱۸۵۷ء پر چالیس (بہ لحاظِ ولادت) سے زیادہ مدت گزر چکی تھی اور پچھلی نصف صدی کے اندر وہ دور بدل چکا تھا جس نے دلی میں قلعۂ معلیٰ کا

مروج دیکھا تھا، گرچہ اس کے کچھ آثار بچے ہوئے تھے اور اس کی یادیں باقی تھیں، علامتیں بھی بالکل ختم نہیں ہوئی تھیں، سلطنتِ شاہ عالم دلی تا پالم رہ گئی تھی تو تختِ بہادر شاہ کم از کم لال قلعے میں موجود تھا اور زبانِ حال سے کہتا نظر آ رہا تھا:

آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم (اقبالؔ)

غالبؔ کے خون میں مغلیہ سلطنت کی وفاداری شامل تھی اور اس تہذیب کے ساتھ ان کی ذہنی وابستگی تھی جو اس سلطنت کے زمانۂ اقتدار میں پروان چڑھی تھی۔ مرزا اس معاشرے کے ایک اہم رکن اور نمائندہ تھے جس کے آغوش میں اس تہذیب کی پرورش ہوئی تھی۔ ان کے آبا کا پیشہ سو پشت سے سپہ گری تھا اور اس کا جلال ان کی طبیعت میں پایا جاتا تھا۔ اپنے اجداد کی شان و شوکت ان کی نگاہوں میں بسی ہوئی تھی اور ان کی صلابت و ہمت شاعر کے احساس کا جزو بن چکی تھی۔ خلق کی خدمت اور قیادت کا تصور غالبؔ کو ورثے میں ملا تھا، گرچہ اس ورثے کا حق ادا کرنے کے لیے سرمایہ ان کے پاس نہیں تھا، سوا ایک زرخیز تخیل کے جس کی لالہ کاری ان کے فن میں نمایاں ہے۔

غالبؔ کا دل زندہ اور طبیعت حساس تھی، ان کا شعور تیز اور ذہن روشن تھا۔ وہ جس طرح ماضی کا تصور کر سکتے تھے اسی طرح حال کا احساس اور مستقبل کا اندیشہ بھی۔ بہر حال، ان کی فکر کا ایک محور اور آرزوؤں کا ایک مرکز تھا۔ ایک معیارِ اقدار بھی انھیں میسر تھا۔ ان کا مطالعہ متنوع، مشاہدہ گہرا اور تجربہ وسیع تھا۔ حالات نے انھیں دردمند بھی بنا دیا تھا، گرچہ ان کی کیفیات میں نشاط کا عنصر غالب تھا۔ ایسا شخص اپنے گرد و پیش سے بے پروا نہیں ہو سکتا تھا۔ جو کچھ اس پر، اس کے عزیزوں، دوستوں، ہم مذہبوں اور ہم وطنوں پر بیت رہی تھی اس کا عکس اس کے دماغ پر پورے طور سے پڑ رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ زمانے کا ورق الٹ چکا ہے، پرانی بساط لپیٹی جا رہی ہے، نئی بساط بچھائی جا رہی ہے، دلی کے قدیم تمدن پر کلکتے کے جدید تمدن کی یلغار شروع ہو چکی ہے اور نیا تمدن گرچہ اپنی آب و تاب سے نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے مگر پرانے تمدن کے تابندہ نقوش بھی کم دل آویز نہیں۔ یہ صورتِ حال قلبِ شاعر میں ایک "طلسمِ پیچ و تاب" پیدا کر رہی تھی۔

ٹی، ایس، الیٹ کے نقطۂ نظر سے غالبؔ کی عظمت یہ تھی کہ وہ اپنی تہذیبی و ادبی روایات کے امین تھے، ان سے باغی نہیں، اور ایک تاریخی احساس بھی رکھتے تھے۔ غالبؔ کی فارسی سے شیفتگی

اردو کی بنیادی روایات سے ان کی ذہنی وابستگی کا سب سے بڑا ثبوت ہے، جب کہ خود فارسی سے وابستگی غالبؔ کی زندگی میں اس زبان کے ادبی و تہذیبی کردار کے سبب تھی۔ اس کے علاوہ "مہر نیم روز" اور "دستنبو" کا مصنف ظاہر ہے کہ تاریخ نگار بھی تھا اور اس کی تاریخی حسیات پوری طرح بیدار تھیں؛ اسے گردشِ ایام کا شعور تھا، وہ انقلابِ دوراں کے اسرار و رموز سے آگاہ تھا۔ اپنی خاندانی روایات پر فخر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا حال زار بھی غالبؔ کو معلوم تھا، اپنے اعزا و احباب اور عوام کے مصایب سے بھی وہ واقف تھے۔ غالبؔ کا بہ قولِ اقبالؔ "اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ" ہونا؛ جب کہ وہ ایک عمر اس کے کوچوں میں گذار چکے تھے، اپنی جگہ ایک تاریخی مفہوم اور روایتی اہمیت رکھتا ہے۔

بہر حال، پاسِ روایت کے ساتھ ساتھ تاریخی حس نے غالبؔ کے ذہن میں مستقبل کا خیال بھی پیدا کیا، اس لیے کہ وہ اس لمحۂ وقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے جس میں وہ سانس لے رہے تھے اور جانتے تھے کہ

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ (اقبالؔ)

غالبؔ ایک منفرد استعداد کے مالک تھے اور اپنے درپے میں وسعت و اضافہ ان کی جدت پسند طبیعت کا اقتضا تھا۔ لہذا وہ ماضی میں اسیر ہو کر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ صورتِ حال کی خرابی بھی انھیں مستقبل سے توقع قایم کرنے کی طرف مایل کر رہی تھی۔ وہ ناخوب کو خوب میں بدلنے کے ساتھ ساتھ خوب سے خوب تر کی جستجو کے بھی قایل تھے۔ ایسی حالت و کیفیت میں ۱۸۵۷ء کا "غدر" جہاں شاعر کے خرمنِ آرزو پر ایک بجلی بن کر گرا وہیں "برق سے شمعِ ماتم خانہ" روشن کرنے کا سامان بھی کر گیا۔ کعبہ غالبؔ کے پیچھے تھا تو کلیسا ان کے آگے اور گرچہ وہ "وفاداری بہ شرطِ استواری" کو "اصلِ ایماں" قرار دیتے تھے اور "آستانِ یار" سے کسی حال میں اٹھنے کے لیے تیار نہیں تھے، چاہے "موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے"، مگر وہ "گردشِ مدام" سے گھبراتے اور ایسی زندگی پر "خاک" بھی ڈالتے تھے جو ایک جگہ "پتھر" کی طرح جمی ہوئی ہو، وہ اپنے ماحول کی زندگی کو ایک نمونۂ عبرت سمجھتے تھے اور نئی نسلوں کو اس کے بارے میں نصیحت کرتے تھے۔ غالبؔ کا معاشرہ

زوال پذیر تھا، بوسیدہ و فرسودہ ہو چکا تھا، خواہ اس کا ماضی نہایت شان دار رہا ہو، جب کہ مستقبل اجنبی ہونے کے سبب غیر یقینی تھا۔ لہذا کوئی ایسا نقشۂ حیات مطلوب تھا جو ماضی کی بہترین قدروں کا امین ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی بہتری کا ضامن بھی ہو۔

غالب کے احساسِ عصر میں دو باتیں بہت نمایاں تھیں، ایک غیر ملکی غلامی کا رنج، دوسرے مسلمانوں کی نکبت کا درد۔ ان دونوں چیزوں کا اظہار انہوں نے خطوط میں تو بہت صاف صاف، مگر اشعار میں لطیف اور ایمائی طریقے سے کیا ہے۔ ایک خط میں دلّی کی بربادی کا ماتم شاعر اس طرح کرتا ہے:

> "اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ کا، باقی سراسر ہنود۔"

(بہ نام مرزا علاء الدین احمد خاں علائیؔ)

دوسرا خط بھی ایسا ہی پُردرد ہے:

> "الور کی ناخوشی، راہ کی محنت کشی، تپ کی حرارت، گرمی کی شرارت، یاس کا عالم، کثرتِ اندوہ و غم، حال کی فکر، مستقبل کا خیال، تباہی کا رنج، آوارگی کا ملال۔ جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔"

(بہ نام میر مہدی حسین مجروحؔ)

یہی احساسات متعدد غزلوں کے حسبِ ذیل اشعار میں بھی پائے جاتے ہیں:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم کا
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

حالات و واقعات پر غالب کے یہ تبصرے ملی کے ساتھ ساتھ قومی نقطۂ نظر سے بھی ہوتے تھے، اس لیے کہ انیسویں صدی بالخصوص غالب کی زندگی تک قومی تہذیب کا مطلب ہی تھا وہ ثقافت جو ہندوستان میں مسلمانوں کے زیر اثر پیدا ہوئی، خود زبانِ اردو اس وقت تک ملک کی واحد قومی زبان تھی اور غالب اپنے عہد میں اس کے سب سے بڑے شاعر۔ سلطنت اور سیاست میں بھی ۱۸۵۷ء تک قیادت مسلمانوں ہی کی تھی۔ لہٰذا انیسویں صدی کے مسلمان کسی مسئلے پر اجتماعی اظہارِ خیال کرتے تھے تو ان کے پیش نظر پورا ملک اور عمومی طور سے ہندوستانی سماج ہوتا تھا، البتہ

"غدر" کے بعد چوں کہ معزول شدہ سلطان کے ہم مذہب ہونے کے سبب مسلمانوں ہی کو خاص طور سے سامراجی ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا اور انھیں مناصب اقتدار سے الگ کرنے کی منصوبہ بند سرکاری کوششیں ہونے لگیں، اس لیے مسلمانوں ہی نے سب سے زیادہ فریاد بھی کی اور انھیں بجا طور سے محسوس ہوا کہ غیر ملکی حکومت انھیں اپنا غدار سمجھ کر کچل دینا چاہتی ہے، حالاں کہ جس پہلی تحریک آزادی کو انگریزوں نے غدر قرار دیا اس میں ہندو بھی مسلمانوں کے دوش بہ دوش تھے، اگرچہ یہ منرور ہے کہ بغاوت کا علم آخری مغل بادشاہ کے نام پر اٹھایا گیا اور یہ یقین کیا گیا کہ بادشاہ نے باغیوں کی سرپرستی کی۔ بہر حال، مسلم دانش وریورے ملک کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کے سب سے بڑے ہندوستانی رہنما، سرسید احمد خاں، نے "اسباب بغاوت ہند" لکھی تو تمام ہندوستانیوں کی وکالت کی، جب کہ ان کا بیان صفائی مسلمانوں کی طرف سے تھا۔

بہر حال، غالب اپنی مجبوریوں کے باوجود ایک بلند ہمت انسان تھے اور سپر انداز ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی ذہنی وابستگی بھی اپنے معاشرے کے ساتھ اس درجہ تھی کہ وہ اس سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی دور بینی انہیں یہ سمجھا رہی تھی کہ مصایب عارضی ہیں اور آنے والا وقت حالات میں بہتری کا سامان کر سکتا ہے۔ غالب کی کش مکش کا حاصل بھی مستقبل کا یہی پیامِ امید تھا:

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

تاب لائے ہی بنے گی غالب
حادثہ سخت ہے اور جان عزیز

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

چناں چہ شاعر اقتدارِ وقت کے خلاف مزاحمت و مقاومت کی دعوت دیتا ہے اور خود بھی بدترین خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہے :

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

اس شعر کا تیور بہت معنی خیز ہے :

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

شاعر کو اپنے "جنونِ نارسا" کا شدید احساس تھا :

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

لہٰذا وہ کم از کم اپنے فن کی حد تک اور اپنے کلام کے ذریعے ایسا کچھ کر جانا چاہتا تھا جو آیندہ نسلوں کو اقدام و عمل کا راستہ دکھا سکے:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

کیا یہ غلام ہندوستان میں آزادی کا خواب نہیں ہے؟ اس شعر میں نہ صرف حرّیت کی تحریک کا اشارہ ہے بلکہ آزادی کے بعد ملک کی نئی تعمیر کا بھی۔ حالات یقیناً مایوس کن تھے، لیکن شاعر امید کا دامن چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا:

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

شاعر کی یہ رجائیت کسی سیاسی منصوبہ بندی پر مبنی نہیں تھی۔ اس کا منبع و محور بنیادی حد تک ماورائی تھا، گرچہ تاریخ کا ایک ادوارِ زرّیں بھی اس کا مطمحِ نظر تھا، جس کی بعض نشانیاں ماضیِ قریب میں بھی موجود رہی ہوں گی:

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

یہی وہ لازوال نصب العین ہے جس کی تمنا مشکل سے مشکل حالات میں بھی غالب کا جذباتی سہارا تھا:

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسم پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

اس تمنا پر آنچ تو بارہا آئی، مگر یہ باقی رہی:

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

یہ ایک نظریۂ حیات پر ایمان کا معاملہ تھا اور عشق تک پہنچا ہوا تھا، جس کا حامل غالب اپنے آپ کو سب سے بڑھ کر سمجھتے تھے، بلکہ اس سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ سنگین حقائق سے ذہنی طور پر جس طرح وہ نبرد آزما ہیں ان کے دور میں کوئی اور نہیں۔ شاعر کے شعور کی یہ بلندی اس سے یہ بلند بانگ دعویٰ کراتی ہے:

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

"اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل"، کے مشہور قطعے کا خاتمہ جس شعر پر ہوتا ہے اس میں بھی شمعِ محفل سب سے پہلے شاعر خود ہے، پھر کوئی اور:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یہ پورا قطعہ اپنے اصلاحی خیالات کے اعتبار سے نئی نسل کے نام غالبؔ کا پند نامہ بھی ہے، وصیت نامہ بھی۔ اس سے شاعر کے ارادوں کا پتہ چلتا ہے اور اس کے حقیقی میلانات کا سراغ ملتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ اپنے دور کو کیا سمجھتے تھے اور اس سے کیا چاہتے تھے۔ قطعے کے اشعار انیسویں صدی کے دوسرے نصف کے ماحول اور معاشرے کی ایک ایسی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کرتے ہیں جس سے عبرت بھی ہوتی ہے، نصیحت بھی۔ اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں یہ جدید مغربی تہذیب کی پُر فریب ہلاکت سامانیوں کے خلاف، جس کا سایہ ۱۸۵۷ء کے بعد نمایاں طور سے اہلِ ہند پر پڑنے لگا تھا، اہلِ مشرق کو غالبؔ کا انتباہ اور تنبیہ ہے، گرچہ تصویر پر زوال آمادہ مشرقی معاشرت کا پرتو بھی عیاں ہے۔ بہر حال، یہ خرابیٔ احوال کا وہ نقشہ ہے جس نے تہذیبی و سیاسی انتشار و بحران کا سامان کیا ہے۔ لہٰذا شاعر اہلِ ملک کو اس کی خطرناکی سے خبردار کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

اصلاح سے آگے بڑھ کر غالبؔ بعض وقت انقلاب کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ حسبِ ذیل مطلع سے شروع ہونے والی ان کی فارسی غزل کا پُر شور آہنگ حالات میں ایک ہمہ گیر تغیّر کی شدید آرزو کا غماز ہے:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

غالبؔ نہ مجتہد تھے نہ مجاہد، نہ قائدِ قوم، لیکن وہ اپنی حدود میں ایک مفکر یا کم از کم صاحبِ فکر ضرور تھے اور صحیح معنوں میں ایک ایسے عظیم فن کار تھے جو دانش ور اور دانش مند یا خردمند بھی ہوتا ہے۔ غالبؔ کی شاعری پر جس عشق کا پرتو پڑا تھا وہ زنانِ بازاری کی محبت ہرگز نہیں تھی، وہ دل کی ایک آگ تھی، دماغ کا ایک سوز تھا، ایک "جذبۂ بے اختیارِ شوق" تھا، یعنی ایک زندہ و تابندہ شعور، گہرا احساس اور تیز ادراک تھا جو تمام ان حالات و مسائل کی بجلیوں سے پیدا ہوا تھا جو شاعر کے آشیاں کے گرد مسلسل چمک رہی تھیں۔ اپنے عہد اور ماحول کے تصورات و محاورات نیز انسے دار

دل کے رنگ و آہنگ سے متاثر ہو کر غالب نے سیاستِ وقت کو تصوف کے حوالوں سے سمجھا اور شاعری کے اشاروں میں بیان کیا۔ اس طرح غالب کا احساسِ عصر ایک نمونۂ فن میں ڈھل گیا، جس کے محرکات و مقاصد پر کچھ روشنی ان کے خطوط سے بھی پڑتی ہے۔ جس بڑے پیمانے پر غالب نے خطوط نگاری کی ہے وہ اپنے دور کے لحاظ سے ایک عوامی رابطے (Public Relations) کا کام تھا اور اس کے ذریعے بھی لوگوں کی توجہ غالب کے افکار و خیالات کی طرف مبذول ہوئی۔ غالب کے شاگردوں اور دوستوں کی ملک گیر وسعت بھی انھیں ایک صاحب عصر یعنی اپنے وقت کا انسان (Man of the time) ثابت کرتی ہے۔ اقتدار اور اس کے وسایل یقیناً غالب کے پاس، بعض درباروں سے وابستہ ہونے کے باوجود، نہیں تھے، مگر اہل کار کے دلوں پر ان کا سکہ ضرور چلتا تھا، کیا عالم کیا عامی، سب ان کے تخیل کی شوخی کے ادا شناس تھے۔ یہ بات ملک الشعرائی کے رسمی منصب سے بہت آگے کی تھی۔ بادشاہ کا استاد ہونا بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ سارا کمال ان فکر انگیز نکات کا تھا جو بہ یک وقت غالب کے اشعار اور خطوط بلکہ پوری ادبی شخصیت سے تراوش کر کے انیسویں صدی کے ہندوستان میں نشر ہو رہے تھے اور اس پُر آشوب دور کے اردو خوانوں اور فارسی دانوں کی ہمت و بصیرت کا سامان کر رہے تھے، مایوس دلوں کے حوصلے بلند کر رہے تھے، افسردہ دلوں کو بشاشت کا پیام دے رہے تھے، ناگواریوں کو ظرافت کی شوخیٔ طبعی سے گوارا بنانے کی ایک صورت پیدا کر رہے تھے، تاریکیوں میں ایک کرن بن کر چمک رہے تھے۔ غالب کا احساسِ عصر تخیل کا ایک ایسا نگار خانہ سجاتا ہے جس میں ان کی مٹتی ہوئی تہذیبی قدریں محفوظ ہو کر اپنی آب و تاب کا نظارہ شاعر کے مرنے کے بعد بھی پچھلے سوا سو سال سے دکھا رہی ہیں۔